

# شخصیت پرستی

از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پر ویز

اسلام کا نصب العین یہ تھا کہ وہ انسان اور خدا کے درمیان براہ راست تعلق پیدا کر دے۔ ایسا تعلق کہ عبودیت و معبود کے درمیان کوئی دوسرا واسطہ نہ رہے۔ ان کے درمیان کوئی دوسری توتھماں نہ ہو۔ نبی اکرم تشریف لائے اور اپنی عظیم النظم تعلیم اور فقید المثال عمل سے بتا دیا کہ اس بلند ترین تخیل اس زمین نصب العین کو کس طرح عمل میں لایا جاسکتا ہے چنانچہ حضور کا مشن ان شاندار الفاظ میں بتایا گیا

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوا لَهُ - وَوَيْلٌ لِلْمُشْرِكِينَ ۝۱۵۲

کہو کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے پس اسی کی طرف سیدھی راہ اختیار کرو۔ اس سے مغفرت مانگو اور مشرکین کے لیے بڑی ہی خرابی ہے۔

اور اسی کی تفسیر تھی جو پیکر اسلام جناب عمرؓ نے وادی ضحان میں گذرتے وقت فرمایا اللہ اکبر یہ وادی ہے جس میں ابن خطاب اونٹ چرایا کرتا تھا اور باپ کی سخت گیری برداشت کیا کرتا تھا اور آج اس رب العزت کا اتنا فضل ہے کہ عمر اور اس کے خدا کے درمیان کوئی دوسری طاقت مائل نہیں اس سے مراد محض جسمانی اور روحانی طاقت ہی نہ تھی بلکہ ہر وہ طاقت جو انسان کے قلب و دماغ پر مستولی ہو کر اس کے اور اس کے خدا کے درمیان حاجب و دربان بن جاتی ہے۔

لیکن ہر وقت نظریہ کی طرح یہ نظریہ تھا بڑا لطیف۔ اور ہر حقیقت عظمیٰ کے مانند یہ حقیقت تھی بڑی عمیق

معمومات کا خوگر انسان، کہ جس کے سجدہ ہائے حجبین نیازِ بیسٹے بیسٹے حقیقتِ مجردہ کو بھی لباس نہیں دیکھنے کے لیے رقصان و صباں رہتے ہیں، اس غیر معمولی تعلق سے زیادہ عرصہ تک کیف اندوز نہ ہو سکا اور اس نے وہ تمام پردے، ایک ایک کر کے پھر سے گرایے جو اس کے اور اس کے خدا کے درمیان حائل تھے اور یہی جنہیں نبی عربی نے ایک ایک کر کے اٹھا دیا تھا۔ قرآن کریم نے بڑی شرح و بسط سے ان تمام مقامات کو ایک ایک کر کے گنا دیا تھا، جہاں سے یہ پردے قلب و دماغ اور سمع و بصر پر گرا کرتے ہیں۔ لہذا جب تک قرآن آنکھوں کے سامنے رہا کسی کی مجال نہ ہوئی کہ ان پردوں کو پھر سامنے لاسکے۔ کہ چراغ کا روشن ہونا ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ اندھیرا دباں نہ آسکے۔ لیکن جب قرآن مجبور ہو گیا۔ جب بنی اسرائیل کی طرح اس نورِ سین کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ تو وہی کچھ ہوا جو ہوتا چلا آتا تھا۔ کہ فطرت کے قوانین اہل اور اس کا دستور غیر تبدیل ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا۔ آئیے ان مختلف پردوں۔ اور ان کے حسین و جمیل نقش و نگار کی سیر کریں جو عقیدت و ارادت کے رنگوں سے مزین اور اطاعت و متابعت کے جواہر سے مرصع ہیں۔

رسول پرستی | خدا کے بعد ماننے والوں کے نزدیک ہمیشہ رسول کی ہستی اشرف ترین مخلوق ہوتی ہے۔ لہذا اگر انسانوں میں سے کسی کو خدا کی جگہ دے جانے کا احتمال ہو سکتا ہے تو سب سے پہلے وہ رسول ہی کی ہستی ہو سکتی ہے۔ اہم سابقہ کی روشنی میں اب میں جو کچھ رہی ہے اس پر قرآنِ تعصیلی روشنی ڈالتا ہے وہ فطرتِ انسانی کے اس کمزور پہلو سے واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس طرح حضراتِ انبیاء کرام خدا بنائے گئے۔ اس کے بیٹے قرار دے گئے۔ الوہیت و انبیت کی مقدس چادر اڑا کر انہیں کس طرح مافوق البشر منوایا گیا۔ قرآن کریم اس خطرناک چور دروازہ کو سب پلائی ہوئی دیواروں سے بند کرنا چاہتا تھا۔ آپ کسی سورۃ کو دیکھیے۔ لفظاً مستناً۔ مجہلاً تفضیلاً۔ اس غلط عقیدہ کے ہر گوشہ کی تردید اس میں موجود ہوگی۔ یعنی قرآن کریم میں جس درجہ خدا کی

توحید پر مختلف عنوانات سے زور دیا گیا ہے۔ اسی درجہ رسولوں کی بشریت بھی متنوع اعتبارات سے بنے نفاذ کی گئی ہے۔ انھیں **بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ** کہا گیا۔ (۲۱: ۶) انہیں خدا کا عبد کہا گیا۔ وہ ہدایت بھی کرتے تھے تو اپنے مالک حقیقی کے حکم سے ہی کرتے تھے۔

وَجَعَلْنَاهُمْ مَثَلًا لِّبَشَرٍ مِّثْلِكَ وَإِنَّا لَمُنشِرُونَ  
اور ہم نے ان کو امام و پیشوا بنا یا جو لوگوں کو ہمارے حکم سے  
ہدایت کرتے تھے اور ہم نے ان کو نیکی کرنے نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ  
دینے کی وحی کی ساوردہ سب جاری بندگی کرتے تھے  
وہ خود خدا کے دروازے کے بھکاری ہوتے تھے۔

فَقَالَ رَبِّ إِنِّي لَمَّا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَتِيرٌ  
اور یسوی نے کہا کہ پروردگار! آپ جو کچھ بھی بہتری  
میرے لیے بھیجیں۔ میں اس کا محتاج ہوں۔

انھیں اپنی ذات تک کے لیے نفع و نقصان کا اختیار نہ ہوتا تھا۔

وہ تم کہہ دو کہ میں اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ مگر جو اللہ چاہے۔ اگر میں غیب کے امور سے واقف ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیا کرتا۔ اور

کوئی مضرت مجھ پر واقع نہ ہوتی۔ میں تو صرف ایمان والوں کے لیے نذیر و بشر ہوں۔ - ۱۸۸:

جو وحی ان پر نازل ہوتی تھی وہ خود اس پر ایمان لاتے تھے وَأَمْرٌ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ

وَأَنْ أَتْلُو الْقُرْآنَ۔ اور اس کی اتباع کرنے پر اسی طرح مامور تھے جس طرح اور ماننے والے۔ (۱۸)

اتَّبِعُوا إِلَّا مَا يَوْحَىٰ إِلَيْكَ (۱۰: ۱۵) ہرچند اللہ تعالیٰ نے اپنے حفاظ میں سے ان کو ایسا بنایا

تھا کہ ان سے معصیت کا سرزد ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ لیکن ان کی بشریت وجودیت کو پختہ ترین طریق پر

وضوح کرنے کے لیے یہاں تک بھی فرما دیا کہ بفرض محال اگر یہ بھی شرک و معصیت کریں تو ان پر بھی

اسی طرح عذاب ہو جس طرح دوسرے انسانوں پر (۱۲: ۲۶) (۱۰: ۱۵) نہیں۔ بلکہ ان کو عام لوگوں

دگنا عذاب ہو۔

”و اگر (بفرض محال) ہم تمہیں ثابت قدم نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھبک پڑتے اور اس صورت میں ہم تمہیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دگنا عذاب دیتے اور کوئی ہمارے خلاف تمہارا مددگار نہ ہوتا۔ (۱۷: ۷۴)“

کفار اعتراض پر اعتراض کرتے کہ رسول بھی ہمارے ہی جیسے انسان کیوں ہوں لیکن قرآن بار بار اس بات پر زور دے جاتا کہ ان وہ انسان ہی ہیں اور انہیں انسان ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔

”و اور کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہوا ہے کہ یہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا بھی ہے۔۔۔ (۲۵: ۷)“

جواب ملتا ہے کہ:-

”ہم نے تم سے پہلے بھی جس قدر رسول بھیجے وہ سب کھانا بھی کھاتے تھے اور

بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔۔۔ (۲۵: ۲۰)“

اور پھر عام انسانوں کی طرح۔ اپنے وقت پر۔ مدت حیات ختم کر کے اس دنیا کو چھوڑ جاتے

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّن قَبْلِكَ الْخَالِدَ ۚ (۲۱: ۳۳) اور ہم نے تم سے پہلے کسی بشر کے لیے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا۔ پھر اگر تم انتقال کر جاؤ گے تو کیا یہ ہمیشہ رہیں گے۔

البتہ ان کی علمی بصیرت۔ حقائق و معارف کے اس افقِ اعلیٰ پر جوتی ہے جہاں عام انسانوں کی

شکاہ نہیں پہنچ سکتی۔ ان کے مزگی و مقدس نفوس کی روحانیت کائنات کے اس معراجِ کمال پر جوتی ہے۔

جہاں عام انسانوں کے شہپر تخیل کے بھی پر جلتے ہیں ان کے قلب و دماغ کی یہ لمبیاں اپنی نظیر آپ جوتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک نمونہ بنا کر بھیجے جاتے ہیں۔ بایں ہمہ وہ ہوتے

انسان ہی ہیں۔ بشریت کے حدود سے خارج نہیں ہوتے۔ خدا کے عیب ہی ہوتے ہیں۔ خود معبود نہیں ہوتے اور جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے آتے اس لیے نہیں کہ انسانوں کو اپنی غلامی اور عبودیت سکھائیں۔ بلکہ اس لیے کہ اپنی تعلیم و عمل سے انسانوں کو خدا کی ایسی عبودیت اور غلامی سکھائیں کہ جس سے تمام دنیا کی غلامی کے طوق و سلاسل اتر جائیں۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ  
وَالْحِكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ  
كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ  
كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ  
الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (۳۰: ۳۶)

کسی انسان کو یہ بات زیبا نہیں کہ خدا اسے کتاب و حکمت و نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ یہی کہے گا، کہ تم اللہ والے بن جاؤ کہ تم کتاب سکھاتے بھی ہو اور پڑھتے بھی ہو۔

حضور خاتم النبیین ہو کر تشریف لائے۔ اور اس مقصد رسالت کو اس انداز سے پورا کیا کہ آپ کے بعد نہ کسی اور پیغام کی ضرورت باقی رہی اور نہ اس پیغام پر کسی نئے سرے سے عمل کر کے دکھانے والے کی کہ یہ پیغام ازلی یہ صوت سرحدی۔ قرآن کی دقتیں میں محفوظ و مصنون چلا آتا ہے۔ کہ باطل اس کے پاس تک نہیں چھو سکتا۔ اور اس پیغام پر عمل، ان نقوش قدم کے ذرے ذرے سے آفتاب کی طرح روشن اور زندہ ہے کہ جن نقوش قدم سے صراطِ مستقیم کے نشان ادھر سے ادھر تک سیدھے ملتے چلے جاتے ہیں۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

لیکن ذرا غور کیجیے کہ مسلمانوں نے اپنے رسول کے ساتھ کیا کیا! کیا وہی نہیں جس سے روکنے کے لیے حضور تشریف لائے تھے۔ یہ احمد بے میم (احد)۔ یہ عرب بلا عین (رب) یہاں تک کہ۔

وہی جو ستویں عرش ہے خدا ہو کر اتر پڑا وہ مبنہ میں مصطفیٰ ہو کر وہ جن کے متعلق خدا کا ارشاد تھا کہ اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں۔ بلکہ خدا کے محتاج ہیں۔

انہیں تمام دنیا کے نفع و نقصان کا مالک و مختار قرار دیدینا۔ انہیں معاذ اللہ خدا بنا دینا نہیں تو اور کیا ہے؟ خدا کے عبد کو خدا کہنا۔ عجیب توحید ہے۔ جب اعتراض کیا جائے تو کہتے ہیں کہ صاحب! یہ صہبائے عشق و محبت کی سرستیاں ہیں، انسان سب کچھ اپنے محبوب کو ہی سمجھتا ہے، عوام کی عقیدہ کو جوش میں لانے کے لیے فی الواقع یہ جو اب معقول نظر آتا ہے۔ لیکن سوال صرف اتنا ہے کہ امم بنی نے جو اپنے رسولوں کو خدا بنا لیا تھا تو کیا بغض و عناد کی بنا پر بنایا تھا؟ وہاں بھی یہی غلو محبت ہی تھا جس نے ان کے محبوب کو وہ کچھ بنا دیا جسے قرآن کریم نے شرک قرار دیا۔ بغض و عناد اور نفرت سے کبھی کسی نے رسولوں کو خدا نہیں بنایا۔ تو کیا پھر یہ دلیل پر لطف نہیں کہ جو کچھ پہلی امتوں نے کیا وہ شرک اور اگر وہی کچھ۔ اسی جذبہ کے ماتحت۔ مسلمان کریں۔ تو میں توحید! ایک ہی بیج اور ایک ہی درخت کے دو مختلف پھل لینا۔ فطرت کا مذاق اڑانا ہے۔ حضور کی محبت جزو ایمان ہے! ایسی محبت جو ماں باپ اولاد۔ اموال۔ بلکہ خود اپنی جان کی محبت سے بھی زیادہ ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک محبت نہ ہو۔ اتباع کامل ہو نہیں سکتا۔ جس عمل کی محرک آتش عشق ہو اس کا ایک لمحہ۔ سو سال کی ٹھنڈے پانی دھو کر وہ سرد نمازوں سے زیادہ دزنی ہوتا ہے۔ کہ یہ صرف سر جھکاتا ہے اور وہ سر کٹاتا ہے۔ یہ زندہ رہنا چاہتا ہے کہ موت کے بعد کا ٹھکانا مل جائے۔ اور وہ مرتا ہے کہ زندگی کسی پر سے نکھار ہو کر ٹھکانے لگے۔ اسے ابھی حشر نثر۔ حساب۔ کتاب کے جھگڑے درپیش ہوتے ہیں۔ اور اس کی یہ حالت کہ تیزی نہیں کیا جاسکتا کہ تلوار رگ جاں سے پہلے چھوٹی تھی، یا جان باب حنت سے۔

عشق نے اک حبت میں ملے کر دیے قصے تمام اس زمین و آسمان کو سیکراں سمجھا تھا میں  
لیکن صہبائے عشق کی سرستیوں میں حفظ مدارج و مراتب بھی قرآن ہی نے سکھایا ہے۔ جو پی کر  
بیک گیا وہ نجانہ بیٹرب کا متوالا ہی نہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ حنت کی شراب میں سب کچھ  
ہے۔ لکن سکر نہیں ہے۔ لہذا۔ خدا خدا ہے۔ اور رسول۔ رسول۔ اور رسول کا رتبہ ہی ہے کہ۔

## بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اس سے آگے بڑھنا بھی اتنا ہی گناہ ہے جتنا اس سے پیچھے ہٹنا۔ کہ ہمیں ہونے کو جہاں خدا کے لیے لالا اللہ کی شہادت کی ضرورت ہے۔ وہاں محمد کے لیے عہدہ و رسول کی شہادت کی بھی۔ اور یہی ایمان و محبت کی صحیح تصویر ہے۔ اس تصویر کے صحیح رخ کے لیے دور رسالت اور صحابہ کبار کا طرز عمل دیکھیے حضور کی عمر بھر ہی تعلیم و تلقین رہی کہ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بلند حیثیت نہ دیں۔ اور اپنے ماننے والوں کے قلب و دماغ پر خدا نیکر نہ پھا جائیں۔ اس کے لیے حضور نے ان میں حریت فکر و نظری کی ایسی روح پھونکی کہ آج اس مزعومہ جمہوریت کے دور میں بھی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ معاملات میں شہادہ صحابہ کا کئی ایک مواقع پر حضور کی علمائے اختلاف و اختلاف کی کابل آزادی حضور کی رائے کے متعلق تحقیق کہ اپنے دور کے یا حکم منصب رسول دیا ہے یا حیثیت محمد۔ یہ سب اس بات کا آئینہ دار ہے کہ حضور ایک عہدہ بن کر کس درجہ انسانیت کی آزادی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اور ایک کا غلام بنا کر کس طرح دنیا بھر کی مادی علامی سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ یہی تھا وہ ماحول جس میں عقل انسانی نے صبح نشوونما پائی۔ اور جس انسان کو خدا نے اس طرح پیدا کیا تھا کہ وہ حیوان کی طرح سر جھکا کر نہ چلے۔ وہ فی الحقیقت اس قابل ہو گیا کہ دنیا میں سر اٹھا کر چلے۔ اسلام انسان کو یہی سر بلندیاں اور سرفرازیاں بخشنے آیا تھا۔ اور یہی اس دین فطرت کی خصوصیت تھی۔ ہم نے جب یہ خصوصیت کھودی تو پھر وہیں جا کرے جہاں سے ابھرے تھے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ - ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ - کس قدر صحیح حقیقت ہے۔

آنہ پرستی | رسولوں کے بعد عوام کی عقیدت کے مرکز نہ ہی پڑا اور دین کے ائمہ ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے اہم سابقہ کے کوائف و حالات سے ہمیں بتایا ہے کہ رسولوں کے بعد یہی لوگ ہیں جن کو خدا کا درجہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَاءَهُمْ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ - (۱۰۳۱)

ان لوگوں نے خدا سے ورے ہی۔ اپنے مذہبی علماء و پیشوایان دین کو خدا بنا لیا۔

اس کے متعلق جب بنی اکرم سے عرض کیا گیا کہ حضور! یہود و نصاریٰ کبھی اپنے احبار و رہبان کو سجدے تو نہیں کیا کرتے تھے۔ تو حضور نے فرمایا کہ کیا یہ لوگ اس چیز کو حلال نہیں سمجھتے تھے جسے وہ حلال بتاویں، اور اسے حرام جسے وہ حرام کہیں؟ یہی ارباب دین و دوا کا بنانا ہے۔ یعنی جو منصب و حیثیت خدا کے لیے ہے وہ ان لوگوں کو دیدیں۔ یہی ان کی پرستش ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ائمہ مذہب کی پرستش یہ ہے کہ۔

(۱) ان کے فیصلوں کو خدا کے فیصلوں کی جگہ دیدی جائے اور

(۲) ان کی ارشادات کو تنقید سے بالا تر سمجھا جائے۔

انہم سابقہ نے ایسا کچھ اس لیے کیا تھا کہ ان کی آسمانی کتابوں کے اجارہ دار و محافظان کے مذہبی راہ نمائے۔ لوگ رشد و ہدایت کے لیے ان کے محتاج تھے۔ چاہیے یہ تھا کہ لوگ ان کے فیصلوں کے لیے کتاب کی سند مانگتے لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔ بلکہ جو کچھ ان اراکین مذہب نے کہہ دیا اسے بھی فرمودہ الہی سمجھ لیا۔ ظاہر ہے کہ عوام ان کے فیصلوں کو اسی لیے خدا کا فیصلہ سمجھتے تھے کہ ان کے نزدیک وہ فیصلے خدا کے احکام کے مطابق ہوتے تھے یعنی وہ ایسا باور کر لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی کہ لوگ خدا کے فیصلوں سے بے نیاز ہو گئے اور انہی احبار و رہبان کو خدا کا قائم مقام سمجھ لیا۔ اب ان کا ہر حکم وحی منزل کی طرح واجب التسلیم اور ان کا ہر فیصلہ آیت الہی کی طرح بالا از تنقید قرار دیا گیا۔ اسی کو قرآن کریم نے شرک قرار دیا ہے۔

قرآن کریم نے فرمایا کہ

قُلْ إِنْ اتَّخَذِيَ هُدًى لِّلَّهِ (۲: ۱۷۳) ہدایت وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے۔



لہذا اتباع واجب قرآن ہی کی ہوئی۔ پھر

(۳) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو واضح مفصل اور آسان بنا دیا کہ اس کے سمجھنے کے لیے کوئی خاص ”برہمنوں“ کی جماعت ہی مختص نہ ہو جائے۔

(۴) پھر قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خود اللہ نے لے لی کہ قیامت تک اس میں نہ رو و بدل ہو یہ ترسیم و نسخ۔

ان بدہیات سے ظاہر ہے کہ دین کا تقاضا ہے کہ ہر زمانہ کے مسلمان۔ قرآن کریم کی روشنی کے ماتحت عقل صحیح سے کام لے کر۔ صراطِ مستقیم پر چلتے جائیں۔ خود بخود منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ ان کو راستہ میں اندھوں کی طرح لامبھی کی ضرورت ہی نہیں کہ روشنی بھی موجود ہے اور بینائی بھی لیکن غور سے دیکھنے کی بجائے واقعی روش پر چل رہے ہیں یا عوام کو تو چھوڑ دیجیے کہ اول تو وہ قرآن کریم کا مصروف ہیں ازیں کچھ جانتے کہ قسم اٹھانے کے کام آتا ہے۔ اور اگر ان میں سے بعض قرآن پڑھتے بھی ہیں تو ایسے کہ لا یَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا آمَاتٍ۔ صرف الفاظ کی تلاوت کرتے ہیں۔ خواص۔ کہ جو مذہب کے واحد اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں۔ ان کی یہ حالت کہ کسی معاملہ کے متعلق دینی فیصلہ پوچھیے۔ بتا دیں گے کہ فلاں امام نے اس کے متعلق یہ فرمایا ہے۔ فلاں علامہ کی یہ رائے ہے نیسی میں ایسا لکھا ہے۔ شایع وقایہ کا یہ خیال ہے۔ غرض کہ ان کی سند کسی نہ کسی انسان تک جا کر رہ جائے گی۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ۔ کہیں خدا کا نام نہیں کسی جگہ قرآن کا ذکر نہیں اور اعتراض کیجئے تو جھٹک لیں گے کہ میاں! ان حضرات (علیہم الرحمۃ) نے بھی تو قرآن پڑھا ہے ایسا لکھا ہے۔ ان سے بڑھ کر اور کو قرآن کو سمجھ سکے گا؟ غور فرمائیے! اس جواب میں۔ اور اس میں جو یہود و نصاریٰ اپنے اجارہ داروں کے متعلق دیتے تھے۔ کیا فرق رہ جاتا ہے۔ کیا انہوں نے ان کو اربابِ باہن دون اللہ ایسا ہی کچھ سمجھ کر نہیں بنایا تھا۔

معاہدوں ہوا کہ جب اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو سلطنت کو لا محالہ تدوین قانون کی ضرورت لاحق ہوئی یا سلام میں چونکہ دین و دنیا الگ الگ شعبے ہیں اس لیے یہ قانون بھی مذہب ہی کی روشنی میں مرتب ہونا تھا۔ علماء عظام اور آئمہ کرام (علیہم الرحمۃ) کہ جن کو اللہ نے قلب و دماغ کا نور عطا فرمایا تھا، جمع ہوئے۔ اور وقت کی ضروریات کو سامنے رکھ کر قانون کے ضابطے مرتب کیے۔ یہ ضابطے سرکاری توثیق سے مستند کر کے عدالتوں میں بھجوا دئے گئے کہ مقدمات کے فیصلے انہی کے مطابق ہوا کریں۔ ظاہر ہے کہ جب کسی آئینی حکومت کے ضوابط قانون مرتب ہو کر نافذ العمل ہو جائیں تو پھر سوائے حکومت کے اور کسی کو اجازت نہیں رہتی کہ وہ بھی قانون مرتب کر سکے یا ان میں ترمیم فرمائی کر سکے۔ بعینہ جس طرح سرکاری ٹھال کے بعد کسی کو سکے رائج الوقت بنانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ تھی فقہ کی ابتدا۔ اور یوں دوسروں کو ایک ہی فقہ کے مطابق فیصلے کرنے پر کھنک اور اس میں کمی بیشی یا رد و بدل کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ لیکن اس سے ظاہر ہے کہ۔

(۱) نہ تو حضرات فقہاء قیامت تک کا علم رکھتے تھے کہ ہر زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق ایک ہی وقت میں مکمل قانون وضع کریں۔

(۲) نہ وہ (نحوہ بالشرعاً خدا ہونے کا دعویٰ کرتے تھے کہ وہ استنباط مسائل میں اپنے نتائج کو تنقید سے بالاتر قرار دیدیں۔

نمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان قوانین میں تبدیلی کا ہونا بھی ضروری تھا اور اس قانون پر کسی معیار اعلیٰ (قرآن کریم) کی روشنی میں تنقید بھی کی جاسکتی تھی۔ لیکن سلطنت نے جس بنا پر دوسروں کو قوانین میں رد و بدل کرنے (بالفاظ دیگر مزید اجتہاد) سے روکا تھا۔ وہ علت تو نظروں سے اوجھل ہو گئی اور بعد میں آنے والوں نے سمجھ لیا کہ بس اب تدبیر و تفکر کا دروازہ باب نبوت کی طرح بند ہو گیا۔ قرآن جتنا سمجھا جانا تھا، سمجھا جا چکا۔ اس سے جو کچھ کیا جاسکتا تھا، حاصل کر لیا گیا۔ اب اس کا وجود تبرکاً

دنیا میں رہے تو رہے۔ عملی حیثیت سے امت اس سے بے نیاز ہو چکی۔ اس کے پڑھنے سے ثواب ضرور ملتا ہے لیکن اس کا سمجھنا دین پر اضا فہ کرنا ہے نتیجہ اس کا ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ قرآن حکیم جیسی زندہ اور زندہ بخش کتاب۔ مکتروں کا مجموعہ۔ بن کے رہ گئی۔ جس سے جہاز پھونک گنڈہ ثنویذ کا کام لیا جاسکے۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کی ادبی اور سانی لطافتوں پر بحث کر کے اسے الفاظ کا گورکھ دیکھ لیا جائے۔ کیا یہی تھی وہ غرض جس کے لیے قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی تھی؟

تدوین فقہ کا تعلق معاملات کی دنیا تک ہی تھا۔ اگر باب اجتہاد بند ہوتا تو وہ اسی حصہ تک بند ہوتا لیکن آہستہ آہستہ دین کے قصر شید کا ہر ایک دروازہ اور کھڑکی بند کر دی گئی جھانق و معارف پر بھی وہی چادر تعلید چھا گئی۔ حتیٰ کہ نوبت بایں جا رسید کہ دین سے قطع نظر، دیگر علوم و فنون میں بھی جو کچھ سلف نے لکھا یا قول فیصل اور حرف آخر سمجھ لیا گیا۔ اب زمانہ کچھ کہے آپ کی بصیرت کا تقاضا کچھ ہو، آپ نہ اس کے خلاف نہ اس سے زیادہ کچھ سمجھ سکتے ہیں جو سمجھا جا چکا، اور نہ کہہ سکتے ہیں جو کہا جا چکا۔ نہ سر میں دماغ اپنا ہو سکتا ہے۔ نہ سینے میں آپ کا دل اپنا۔ نہ آپ کی اپنی آنکھیں نہ سننے کا، اُولَئِكَ كَمَا لَا نَفَامٌ بَلَدُهُمْ اَصْدَلُ۔ دنیا کہیں سے کہیں چلی گئی۔ لیکن امت مسلمہ کی سطح فہم اور راک جو ہزار سال پہلے تھی وہی آج ہے۔

یہ بصری جبین نیاز ہے کہ جہاں دہری تھی دہری رہی، وہ ساری گلی کی قیامتیں کہ لمحہ کے لمحے اکھڑ گئے

خورتو بھئیے کیا یہ سلف کی پرستش نہیں! کیا یہ ان کو احبار و رہبان کی طرح خدا کا درجہ دینا نہیں! کیا ان کی نگاہ کو قیامت تک کے آنے والے واقعات کا مبصر اور تمام حالات و کیفیات کا واقف سمجھنا اور ان کے فیصلوں کو تنقید سے بالاتر قرار دینا، انہیں خدائی صفات کا حامل سمجھنا نہیں! بشر تعالیٰ نے اللہ والے (ربانین) بننے کے لیے قرآن کریم کو ہی معیار قرار دیا تھا (۸: ۷۸) اس نے تو قرآن کریم کو نازل فرما کر اس کی تمسین و تفصیل بھی اپنے ذمہ لے لی تھی کہ لوگ اس باب میں بھی دوسروں کے

تحتاج ہو کر ان کی عبودیت اختیار نہ کر لیں۔

النَّسْرِ كِتَابٌ أُخْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ  
مِنْ لَدُنِّ جَنَّاتٍ جَبِينٍ - أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا  
اللَّهَ - إِنَّنِي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ (۱۱۱-۱۱۲)

اختیار نہ کرو۔ (اور) میں تم کو اس کی طرف سے آگاہ کرنے اور بشارت دینے کے لیے (آیا ہوں)۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کی غرض کیا بتلاتا ہے جو نبی اکرم کے واسطے سے دنیا تک پہنچا۔

سورہ جاثیہ کے دوسرے رکوع میں سلسلہ کلام یوں شروع ہوتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو کتاب و حکمت دے

نبوت عطا فرمائی ان کو دیگر اقوام عالم پر فضیلت عطا کی، اور انہیں دین کی بنیاد بھی دی گئیں لیکن انہوں

نے علم آجانے کے بعد باہمی ضد اور ہٹ سے اختلافات پیدا کر لیے۔ ان کے اختلافات کا توحیامت میں

فیصلہ کر دیا جائے گا۔ لیکن دنیا کو تو ضرورت تھی کہ خدا کا وہ دین جو انسانی اختلافات کی نذر ہو کر مسخ

ہو چکا تھا پھر سے دنیا کو مل جائے۔ اس کے لیے۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا  
وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۱۱۸: ۱۱۹)

پھر ہم نے تمہیں اسے رسول، دین کی ایک شریعت پر

مبعوث کیا۔ پس اس کا اتباع کرو۔ اور ان لوگوں

کے خیالات کا اتباع مت کرو جن کو علم نہیں ہے۔

یہ دین شریعت کہاں ہے۔ اس کا جواب بھی وہی ہے کہ

هَذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ  
لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ (۳۰: ۴۵)

یا قرآن ہے جو تمام نوع انسانی کے لیے بصیرت ہے اور

ایمان والوں کے لیے ہدایت و رحمت۔

قرآن ہر زمانے کے انسانوں کے لیے بصائر ہے۔ اس لیے اس میں بار بار غور و فکر۔ تدبر و تفحص کی

تائید کی گئی ہے۔ جو ایسا نہیں کرتے ان کو کہیں شرالدواب کہا گیا۔ کہیں کالانعام بتایا گیا جہنم ان کے

بھری گئی۔ ان کے قلوب پر مہریں۔ ان کی آنکھوں پر پردے اور ان کے کانوں میں ڈاٹ بتائے گئے۔  
 کہیے کہ جو کتاب اس طرح عقل و بصیرت کو دعوت دیتی پڑھیں جس کے لانے والے کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہو کہ  
 اذْعُوا إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِ۔ اس کتاب میں کو راہ تعلیم کی کہاں گنجائش ہے  
 جو دو تعلق وہ کب ردا رکھ سکتی ہے قرآن انسانوں کو طلعت سے نکال کر نور کی طرف لے جانے کے  
 لیے آیا تھا۔ لیکن آنکھیں بند کر کے بیٹھا رہنے والا تو خواہ طلعت میں ہو خواہ نور میں یکساں ہے۔ علم  
 اجتماعی حیثیت سے تو یوں ہیں وراثت منتقل ہوتا اور قومی سرمایہ کی طرح بڑھتا رہتا ہے، لیکن جو قوم  
 علم کی کسی خاص سطح کو نتھکائے کمال سمجھ کر فارغ ہو بیٹھے اس کا مال معلوم چنانچہ وہ قوم جو دنیا  
 میں تمام نوع انسانی کی امامت کے لئے آئی تھی۔ ہمیشہ دنیا کے پیچھے پیچھے رہنے کی عادی ہو گئی۔ وہ ملت  
 جس کے ہاتھ میں اس قدر عظیم اشان قذیل دی گئی تھی کہ جس کی روشنی مشرق و مغرب کے امتیازات  
 بٹا کر اقصائے عالم کو منور کرنے والی تھی۔ اب ہر جگہ کو شمع راہ سمجھ کر اس کے پیچھے لپکنے کی خوگر ہو گئی۔  
 یہ راستہ آسان تھا۔ اس میں سہل انکاری اور آرام طلبی تھی۔ اجتہاد کے لیے ذہنی جہاد اور اس کے ساتھ  
 ساتھ جسمانی مجاہدے کی ضرورت تھی تعلیم میں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ جس کو باپ دادا کے ذریعہ  
 سے ریاست مل جائے۔ وہ خود محنت کیوں کرے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وراثت میں سکھانے کو وہ  
 لے جو اصحاب کعبہ کے سکھ کی طرح صدیوں پہلے کا ہو۔ درحقیقت تعلیم اختیار ہی وہ قوم کرتی ہے جس  
 میں مجاہدانہ روح باقی نہ رہے۔ ہر قوم کی تاریخ ہمیں ایسا ہی بتاتی ہے۔ خود قرآن کریم اس پر شاہد ہے۔  
 وہ تم سے پہلے (بھی) کوئی رسول کسی سببی میں نہیں آیا کہ وہاں کے خوش حال (آرام طلب،  
 لوگوں نے یہ نہ کہہ دیا ہو کہ ہم نے اپنے آباؤ کو ایک طریق پر پایا اور ہم انہی کے نشانات کا  
 اقتدا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ (۲۳: ۲۳)

لیکن یہ یاد رہے کہ اس مکانات عمل کے دن کہ جب ”سمع و لعل و قلب ہر ایک سے الگ الگ

باز پرس ہوگی۔ آپ یہ کہہ نہیں چھوٹ سکیں گے کہ ہم نے فلاں امام کی تقلید کی تھی۔ فلاں عالم کا اتباع کیا تھا۔ متبوع حضرات آپ کے اس اتباع سے ہی انکار کر دیں گے۔ کیونکہ انہوں نے کبھی کسی کو ایسے اتباع کا حکم نہیں دیا تھا

”جس وقت وہ لوگ جو متبوع تھے اپنے تبعین سے بیزار ہو جائیں گے۔ اور سب عذاب کا

مشاوردہ کریں گے۔ ان کے باہمی تعلقات سب منقطع ہو جائیں گے“ (۱۶۶: ۳)

اس وقت تبعین سے پوچھا جائیگا کہ تم نے جو ان کی پرستش شروع کر دی۔

کیا تمہارے پاس پیغمبر بنیات لے کر نہیں آئے تھے۔ وہ کہیں گے کہ ہاں آئے تو تھے۔ (۵۰: ۵۰)

اس سے خود سمجھ لیجئے کہ مقصد کیا ہوا۔

ہمارا مطلب یہ نہیں کہ سلف سے جو کچھ تمہارے پاس آیا ہے معاذ اللہ سب گمراہ کن ہے۔

یسا کون کہہ سکتا ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ جو کچھ تمہیں ان سے ملے آنکھیں بند کر کے اس کی پیروی نہ

کرو۔ بلکہ شمع قرآنی کی روشنی میں ہمیشہ آنکھیں کھلی رکھو۔ وہ بھی تمہاری ہی طرح کے انسان تھے۔ غلطی

کر سکتے تھے۔ لیکن قرآن کی کوئی کبھی غلطی نہیں کر سکتی۔ جو اس کو ٹی پر پورا اترے دین وہی ہے

اور میں۔ وذلك الدين القيم۔

یہ تو ائمہ فقہ اور علماء سلف کی تقلید و اتباع سے متعلق تھا۔ ائمہ پرستی میں ان کے علاوہ ایک اور

جماعت بھی ہے۔ لیکن وہ ہمارے اس موضوع سے خارج ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے ائمہ حضرات کو معصوم

مانتے ہیں۔ اور اس امامت کو ایک خاندان میں مقید و محدود سمجھتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس شخص

کو ہم قرآن اس عقیدہ کی اجازت نہ دے اس کے نزدیک تو یہ عقیدہ سرتاسر نسل پرستی بن کے رہ

جاتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا بنیادی اور اصولی فرق ہے جس کی وجہ سے ہمارا ان حضرات سے <sup>مطلق</sup> تعلق

ہی بے معنی ہے۔ (باقی)